امتحانی مشق نمبر 2

(یونٹ 5 تا 9)

سوال 1- سلیم احمد کے تنقیدی نظریات پر مضمون قلم بند کریں۔ (20)

سوال 2- اردو تحقیق کی روایت پر تفصیلی مضمون قلم بند کریں۔ (20)

سوال 3- ترقی پسند تنقید پر تفصیلی مضمون قلم بند کریں۔ (20)

سوال 4- سلیم احمد کی تنقیدی خدمات پر تفصیلی روشنی ڈالیں۔ (20)

سوال 5- اردو تحقیق میں مشفق خواجہ کا مقام و مرتبہ متعین کریں۔ (20)

ANS 01

مشرق کی حد تک تو مسئلہ بالکل واضح ہے، مسلمان ہوں یا ہندو، یا بدھ، سب کا اتفاق دو چیزوں پر تو ہے : پہلی بات یہ ہے کہ معاشرتی روایت، ادبی روایت، دینی روایت، یہ الگ الگ چیزیں نہیں بلکہ ایک بڑی اور واحد روایت ہے جو سب کی بنیاد ہے۔ اور باقی سب چھوٹی روایتیں اسی کا حصہ ہیں اور اسی سے نکلی ہیں۔ اسلامی اصطلاح کے مطابق اس بنیادی روایت کا نام ’دین‘ ہے۔ ثانوی روایتوں میں شامل ہونے کے لیے اس بنیادی روایت میں شامل ہونا لازمی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ بنیادی روایت نکلتی ہے کسی آسمانی یا مقدس کتاب سے۔ پھر اس کی وضاحت کرتے ہیں اس کے مستند نمائندے اور صرف انہیں مستند نمائندوں کا قول قابل استناد ہوتاہے۔ پھر ایک تیسری بات ہے جو ہر زبان میں خود لفظ روایت کے مفہوم کا لازمی جزو ہے۔ یعنی روایت وہ چیز ہے جو ایک آدمی سے دوسرے آدمی تک پہنچائی جائے ۔ سلیم صاحب کے نزدیک زبانی روایت ہی اصلی روایت ہے۔ ’جدیدیت‘ میں لکھتے ہیں : ”صرف اسلام ہی نہیں، مشرق کے سارے ادیان کا انحصار زیادہ تر زبانی روایت پر ہے، لکھی ہوئی کتابوں پر نہیں۔ ہمارے نزدیک کسی دین کے زندہ ہونے کا معیار یہ ہے کہ روایت شروع سے لے کر آج تک کلی حیثیت سے سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی چلی آ رہی ہو“

مشرق میں جو بڑے بڑے مذاہب پیدا ہوئے ہیں، وہ اسلام، یہودیت، عیسائیت، ہندو مت، بدھ مت، تاؤ مذہب، اور زرتشتی مذہب ہیں۔ اب جہاں تک یہودیت کا تعلق ہے سلیم صاحب کو یہ بات معلوم ہی ہو گی کہ حضرت موسیٰ کو وحی تحریری صورت میں بھی ملی تھی۔ دین ابراہیمی میں جتنے انبیاء ہوئے ہیں، ان کی وحی کو قرآن نے ’کتاب‘ کا نام دیا ہے۔ اور کتاب تحریری چیز ہی کو کہتے ہیں۔ جہاں تک موجودہ تورات کی تحریری اور زبانی روایت کا تعلق ہے۔

وہ دونوں منقطع ہیں اور کسی روایت کی سند حضرت موسیٰ تک نہیں پہنچتی۔ حضرت موسیٰ نے اپنی زندگی میں تورات کی بارہ نقلیں کرواکر بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں کے سپرد کی تھیں اور بنی لادی کو بطور خاص تورات کی حفاظت پر مامور کیا تھا۔ بعد میں بنی لاوی ہی

Downloaded From Tajassus.com

مذہبی پیشوا ئی کے منصب پر فائز ہوئے۔ تورات مٹی کی تختیوں پر لکھی ہوئی ایک مقدس صندوق میں بند تھی۔ حضرت موسیٰؑ کی زندگی کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد وہ تورات سے اس حد تک غافل ہوگئے تھے کہ انہیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اس نام کی کوئی کتاب ان کے پاس موجود بھی ہے۔

یہودیہ کے بادشاہ یوسیاہ کے عہد میں جب ہیکل کی مرمت ہوئی تو اتفاق سے سردار کاہن کو ایک جگہ تورات رکھی ہوئی مل گئی اور اسے بادشاہ کے سامنے یوں پیش کیا گیا جیسے ایک عجیب انکشاف ہوا ہو۔ 597 قبل مسیح میں جب بخت نصر نے بیت المقدس پر حملہ کر کے ہیکل میں آگ لگا دی تو بقیہ چیزوں کے ساتھ وہ مقدس صندوق بھی جل گیا۔ اس تباہی کے دو اڑھائی سو برس بعد حضرت عزیر نے بنی اسرائیل کے کاہنوں اور لاویوں کے ساتھ مل کر تورات کو دوبارہ مرتب کیا۔

یہاں یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ یہود میں تورات کے حافظ موجود تھے۔ جو لوگ تورات سے اس حد تک غافل ہوں ان کا حفظ کرنا بعید ازقیاس ہے۔ پھر زبانی روایت کا عالم یہ تھا کہ یہود کے یہاں خدا کے لیے جو لفظ تھا وہ اس کے تلفظ سے بھی واقف نہ تھے۔ اور اس طرح انہوں نے خدا کے نام کو ضائع کر دیا تھا۔ آج دنیا میں وہ عبرانی نسخہ بھی موجود نہیں ہے جسے حضرت عزیر نے مرتب کیا تھا بلکہ صرف اس کا یونانی ترجمہ موجود ہے۔ اس اعتبار سے یہود کے یہاں روایت کے تسلسل کا حال بخوبی معلوم ہوجاتا ہے ۔

عیسائیت کا دار و مدار اناجیل اربعہ اور رسولوں کے خطوط اور اعمال پر ہے۔ ان چاروں انجیلوں کے مصنف نہ تو حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں میں سے ہیں اور نہ واقعات کے عینی شاہد۔ ان انجیلوں کازمانہ تصنیف حضرت عیسیٰؑ کے بعد ستر سے ایک سو چالیس سال کا ہے۔ ان میں سے یوحنا کی انجیل تو بطور خاص پال کے زیراثر لکھی گئی ہے۔ خود پال حضرت مسیح ؑ کا حواری نہ تھا۔ بلکہ ان کی زندگی میں ان کا سخت مخالف رہا تھا۔ بعد میں اس نے یہ کہا کہ اسے مسیح ؑ کی تعلیمات کو ان کے ان پڑھ شاگردوں سے معلوم کرنے کی ضرورت نہیں۔

چنانچہ اس کا دعویٰ یہ تھا کہ اس نے اسے براہ راست مسیح ؑ سے بطریق مکاشفہ اخذ کیا ہے۔ اسی لیے حضرت مسیحؑ کے سچے حواریوں نے پال کو مبتدع اور گمراہ قرار دیا تھا۔ ابتدا میں انجیلوں کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی۔ 327 عیسوی میں ایتھاناسیوس ATHANASIUS کے ایک خط کے ذریعے معتبر و مسلم کتابوں کے مجموعہ کا اعلان کیا گیا۔ پھر اس کی توثیق 382 میں پوپ ڈیمیسیس DEMESIUS کی زیر صدارت منعقد ہونے والی ایک مجلس نے کی۔ موجودہ عہد نامہ جدید کا پہلا مستند متن قرطاجنا کی کونسل میں منظور کیا گیا جو 397 ء میں منعقد

Downloaded From Tajassus.com

ہوئی تھی اور یہ تمام تر فیصلے پولوسی عقائد کی بنا پر کیے گئے کیونکہ اس وقت تک تثلیت کو مسیحیت کا سرکاری عقیدہ قرار دیاجاچکا تھا۔ (3)

زرتشتی مذہب کے ماننے والے اوستاتیر کو اپنی مقدس کتاب قرار دیتے ہیں محققین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ ایک جعلی کتاب ہے اوراس کا زرتشت سے کوئی تعلق نہیں۔ (4)

چین میں تاؤمذہب کے ماننے والے بھی ایک مذہبی صحیفہ تاؤتی چنگ کو لاؤتزے سے منسوب کرتے ہیں۔ اول تو لاؤتزے کی شخصیت ہی مشتبہ ہے کہ آیا کہ وہ کوئی تاریخی شخص تھا یا محض ایک اساطیری کردار۔ اگر اس کی شخصیت کو تسلیم کر بھی لیا جائے تو چینی مذہب کے ماہرین اس با ت پر متفق ہیں کہ مذکورہ بالا صحیفہ اس کے بہت بعد کی تصنیف ہے۔ (5)

جہاں تک ہندو مت کا تعلق ہے تو اس کی قدیم ترین کتابیں وید ہیں۔ ویدوں کے زمانہ تصنیف کے بارے میں شدید اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ پھر ان کے مصنفین کے نام بھی کسی کو معلوم نہیں۔ ویاس کہ جس کے بارے میں دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اس نے ویدوں کو مرتب کیا، خود ایک اساطیری شخصیت ہے جس کا شاید کوئی وجود نہیں تھا۔ یہی حال اپنشدوں اور براہمنوں کا ہے۔ ان کے بارے میں یہ بیان کرنا ممکن ہی نہیں کہ ان کے مصنف کون لوگ تھے، ان کا زمانہ کون سا تھا، اگر یہ کتابیں الہامی ہیں تو وہ کون سے پیغمبر تھے جن پر نازل ہوئیں۔

یہی حال بدھ مذہب کا ہے۔ بدھ مذہب کے جتنے بھی گروہ ہیں وہ سب اپنی روایت کو مہاتما بدھ تک پہنچانے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ مگر محققین اس بات پر متفق ہیں کہ کسی روایت کا بدھ پہنچنا بالکل مشکوک ہے۔ فی الاصل آج یہ جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ بدھ کی اصل تعلیمات فی الواقع کیا تھیں اور بعد میں ان میں کیا تغیرو تبدل ہوا ہے۔

مسلمانوں نے حدیث میں اسماء الرجال جیسا عظیم الشان علم تخلیق کیا، جس پر وہ بجا طور پر فخرکر سکتے ہیں۔ ایسا کوئی علم کسی دوسرے مذہب کے پاس موجود نہیں ہے جس میں روایت کا سلسلہ متصلاً زمانہ نزول تک پہنچتا ہو۔ نراد سی چودھری نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ اسلام کے علاوہ دنیامیں جتنے بھی مذاہب موجود ہیں وہ اپنی اصل اور ابتدائی صورت سے بہت مختلف ہیں۔ اب اگر سلیم صاحب کی اس بات کو پیش نظر رکھا جائے کہ دین کے زندہ ہونے کا معیار یہ ہے کہ روایت شروع سے لے کر آج تک سینہ بہ سینہ کلی حیثیت سے منتقل ہوتی چلی آ رہی ہو تو اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا مذہب زندہ ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اس طرح سلیم صاحب کا وحدت ادیان کا تمام فلسفہ ان کے اپنے بتائے ہوئے اصول کی بنیاد پر ہی رد ہوجاتا ہے ۔ جہاں تک اسلام کے بارے میں ان کے اس دعوے کا تعلق ہے کہ اس کا انحصار زبانی روایت پر ہے تو یہ دعویٰ عجیب ہی نہیں مضحکہ خیز بھی ہے۔ اس بات پر ہر مسلمان کا ایمان ہے کہ اسلام اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ دین ہے۔ جس کے لیے اس نے حضرت

Downloaded From Tajassus.com

محمد ﷺ کو اپنا رسول اور نبی مقرر کیا۔ وحی الٰہی من وعن قرآن کے 'بین الدفتین' محفوظ ہے اور ہر قسم کے تغیر سے مامون ومصؤن ہے۔ کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ رب العزت نے لیا ہے۔

ANS 02

لفظ "تحقیق" عربی زبان کا مصدر ہے جس کا مادہ 'حقّق، یُحَقّقُ، تَحقیقاً سے ماخوذ ہے۔ جو باطل کی ضد ہے۔حق کا مطلب ثابت کرنا، ثبوت فراہم کرناہے۔

تحقیق کا کام حال کو بہتر بنانا، مستقبل کو سنوارنا، اور ماضی کی تاریکیوں کو روشنی عطا کرنا ہے۔تحقیق کا ایک اہم کام گمشدہ دفینوں کو دریافت کرنا اور ماضی کی تاریکیوں کو دور کرکے اسے روشنی عطا کرنا ہے۔بقولِ سید عبداللہ:

"تحقیق کے لغوی معنی کسی شے کی حقیقت کا اثبات ہے۔اصطلاحاً یہ ایک ایسے طرز مطالعہ کا نام ہے جس میں موجود مواد کے صحیح یا غلط کو بعض مسلمات کی روشنی میں پرکھا جاتا ہے۔تاریخی تحقیق میں کسی امر واقعہ کے وقوع کے امکان و انکار کی چھان بین مد نظر ہوتی ہے۔"(1)

تحقیق ماضی کی گمشدہ کڑیاں دریافت کرتی ہے اور تاریخی تسلسل کا فریضہ انجام دیتی ہے اور ادب کو اس کے ارتقا کی صورت میں مربوط کرتی ہے۔تحقیق موجود مواد کو مرتب کرتی ہے، اس کا تجزیہ کرتی ہے، اس پر تنقید کرتی ہے اور پھر اس سے ہونے والے نتائج سے آگاہ کرتی ہے۔مالک رام ادبی تحقیق کے حوالے سے رقمطراز ہیں :

"تحقیق عربی زبان کا لفظ ہے۔اس کا مادہ 'ح-ق-ق' جس کے معنی ہیں کھرے اور کھوٹے کی چھان بین یا بات کی تصدیق کرنا۔دوسرے الفاظ میں تحقیق کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنے علم و ادب میں کھرے کو کھوٹے سے، مغز کو چھلکے سے، حق کو باطل سے الگ کریں۔ انگریزی لفظ" ریسرچ "کے بھی یہی معنی اور مقاصد ہیں۔"(2)

اردو میں خالص ادبی تحقیق کا آغازبیسوی صدی کے اوائل میں ہوتا ہے۔اس سلسلے میں مولوی عبدالحق، حافظ محمود شیرولنی، قاضی عبدالودود، امتیاز علی عرشی، وغیرہ بزرگوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ اردو زبان و ادب میں صرف کیا اور اردو تحقیق کا معیار بلند کیا۔

بیسویں صدی میں تحقیقی روایت میں توسیع کرنے والے ایک اہم بزرگ مولوی عبدالحق ہیں۔ مولوی عبدللحق کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ انہوں نے تحقیقِ ادب کو ایک قومی نصب العین کی طرح قبول کیا اور اسے عمر بھر جاری رکھا۔قدیم دکنی مخطوطوں کی تلاش وصحت ان کے بنیادی کاموں میں سے ہیں۔ دکن کے غیر دریافت ادب کو منظر عام پر

Downloaded From Tajassus.com

لاکر انہوں نے معلوم ادبی تاریخ کی دنیا کی کایا پلٹ دی۔(3) نو دریافت کتابوں میں ان کے مبسوط مقدمے ، حاشیے اور صحتِ متن سے مستقبل کی تنقید کی راہ ہموار ہوئی۔"معراج العاشقین"، "سب رس"، "قطب مشتری"اور "علی نامہ" وغیرہ اسی سلسلے کی کتابیں ہیں۔ ان کا مختصر وقیع مقالہ " اردو کی نشونما میں علمائے کرام کا کام" بنیادی مأخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔

اردو میں تحقیق کی باضابطہ ابتدا ء حافظ محمود شیرانی سے ہوتی ہے۔ وہ پہلے محقق ہیں جنہوں نے تحقیق کے اصول پائیدار بنیادوں پر قائم کیے اور جدید مغربی اصولوں کو رواج دیا۔انہوں نے حوالے درج کرنے میں ذمہ داری سے کام لیا اور مختلف مأخذ اور ذرائع سے اخذ ہونے والی معلومات پر جرح و تعدیل اور احتساب کی صحت مند روایت قائم کی۔ساتھ ہی منطقی اصولوں پر مبنی استدلال اور مغالطوں سے گریز تحقیق کار کے لیے ضروری ٹھہرایا۔

"پنجاب میں اردو"، "تنقید آب حیات"، "تنقید شعرالعجم" اور " پرتھوی راج رسوا" جیسی کتابوں کے علاوہ بیشمار مقالات میں ان کی تحقیقی ژرف نگاہی اور بصیرت کی اعلیٰ ترین مثالیں موجود ہیں۔ داخلی اور خارجی شہادتوں کی یکساں اہمیت دینے والے اس اہم محقق کو بجاطور پر تحقیق و تدوین کو معلم اول شمار کرکے شائع کئے

آزادی سے پہلے اردو کی اس تحقیقی روایت کو درجہ بالا بزرگوں کے علاوہ بعض دیگر علمائے ادب و تحقیق نے بھی تقویت پہنچائی اور اپنے تحقیقی کا رناموں سے اس کی روایت کو مستحکم کیا۔محی الدین قادری زور، مولوی محمد شفیع، برج موہن دتاتر کیفی، شیخ چاند حسن، حامد حسن قادری، مولانا امتیاز علی عرشی، شیخ محمد اکرام، نصیرالدین ہاشمی، مالک رام اور مسعود حسین خان رضوی ادیب وغیرہ چند ایسے ہی نام ہیں جنہوں نے اپنے اپنے دائرہ کار میں تحقیق کی ذمہ داری نبھاتے ہوئے زبان وادب کے بے شمار مخفی گوشوں کے بے نقاب کیا اور اردو تحقیق کی ترقی میں اپنا کردار ادا کیا۔ان علمائے ادب کی تحقیقات کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے ہے کہ آزادی سے قبل کی ربع صدی کو ادبی تحقیق کے ارتقاء میں زرین دور شمار کیا گیا۔اس عہد میں اردو ادب کی تاریخ میں بعض بنیادی اضافے ہوئے اورہمارے چوٹی کے محققین نے اردو تحقیق کو اعتبار بخشا۔ ان میں سے اکثر محققین کی تحقیق کا دائرہ کار آزادی کے بعد تک جاری رہا۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زورا نے ترتیب متن اور مخطوطات شناسی کے فن کو خاص رواج دیا اور قلمی کتابوں کی فہرست سازی سے زیادہ مخطوطات کی توضیحات پر توجہ

Downloaded From Tajassus.com

دی۔مخطوطات شناسی ایک مشکل اور دقت طلب فن ہے۔ترقیمے پڑھنا، داخلی اور خارجی شواہد سے نتائج اخذ کرنا اور حوالوں سے تصنیف اور صاحب تصنیف کے نام اور عہد کی باذیافت ایسا عمل ہے جس میں محققانہ ذہن کی کارفرمائی ہوتی ہے۔بقولِ آفتاب احمد آفاقی :

"زورؔنے مغربی ادب و تنقید اور اصول تحقیق سے استفادہ کیا ہے اور اردو میں قدیم مخطوطات کی ترتیب و تدوین اور ادباء و شعراء کے حالات کی بازیافت میں ان اصولوں کو برتا ہے۔"(4)

ڈاکٹر زور کی کتابوں میں " اردو شہ پارے " اور "کلیات قلی کتب شاہ "کی ترتیب بڑی اہم ہیں۔

اردو تحقیق کی دنیا میں قاضی عبدالودود سب سے زیادہ محتاط محقق تسلیم کئے جاتے ہیں اور ان کے کاموں کو 'خالص تحقیق' کے زمرے میں رکھا جاتا ہے۔بقولِ آفتاب احمد آفاقی :

"واقعہ یہ ہے کہ اردو تحقیق میں احتیاط پسندی اور مضبوط دلیلوں اور دعوؤں کی بنیاد پر نتیجہ اخذ کرنے کی روش قاضی صاحب کی تحقیق کا وصفِ خاص ہے۔ان اوصاف کی بناپر گیان چند جین انہیں بت شکن محقق اور رشید حسن خان'معلم ثانی' کہتے ہیں۔"(5)

ہر چند کہ قاضی عبدالودو کا بیشتر تحقیقی کام آزادی کے بعد وجود میں آیا۔لیکن اپنے ابتدائی کاموں سے ہی وہ اردو تحقیق میں اعتبار حاصل کرچکے تھے۔رسالہ معاصر، نوائے ادب اور معیار وغیرہ میں ان کے متعدد تحقیقی مضامین شائع ہوئے۔یہ درست ہے کہ تحقیقی مبادیات پر کوئی مستقل کتاب انہوں نے نہیں لکھی۔لیکن ان کے مضامین تحقیق کے رہنما اصول کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کا " مثنوی مہاراجہ کلیان سنگھ عاشق" کے عنوان سے لکھا ہوا مضمون بلا مبالغہ تحقیق کے بنیادی اصولوں پر مبنی ہے۔بعد ازاں ایک طویل اور قسط وار تحقیقی مقالہ بہ عنوان"شاہ کمال دیوروی عظیم آبادی" شائع ہوا جوکئی شماروں پر محیط ہے اور اپنی تاریخی اور تحقیقی حیثیت کے اعتبار سے بڑا اہم ہے۔

قاضی عبدالودود نے چار کتابیں ترتیب دیں ان میں تذکرۂ شعرا مصنفہ ابن طوفان، دیوان جوشش، قاطع برہان و رسائل متعلقہ اور شہر آشوب قلق شامل ہیں۔ان کے مضامین پر مشتمل دو مجموعے عیارستان اور اشتروسوزن بھی ان کے تحقیقی کا رنامے ہیں۔

امتیاز علی عرشی ماہر غالبیات کی حیثیت سے اردو تحقیق کی دنیا میں معروف ہیں۔ ان کے کاموں میں "مکاتیب غالب" ترتیب متن کی عمدہ مثال ہے۔جس میں غالب کے

Downloaded From Tajassus.com

خطوط کو سائینٹفک انداز میں پوری احتیاط کے ساتھ مرتب کیا گیا۔امتیاز عرشی نے واحد یکتا کی دستورالفصاحت" اور شاہ عالم آفتاب کا کلام نادراتِ شاہی" کی ترتیب و تدوین بھی کی ہیں۔ تحقیق متن ایک محقق کی حیثیت سے ان کا نمایاں مقام ہے۔

تقسیم ہند کے بعد سے اب تک کے عرصے میں اردو تحقیق کی روایت کو ثروت مند بنانے میں جن محققین نے اہم کردار ادا کیا ہے ان میں ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر سہیل بخاری، ڈاکٹر جمیل جالبی، رشید حسن خان، مشفق خواجہ، ڈاکٹر گیان چند جین، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، ڈاکٹر یوسف حسین خان، ڈاکٹر مسعود حسین خان، ڈاکٹر خلیق انجم وغیرہ چند ایسے نام ہیں جو اردو تحقیق کی عمارت میں اہم ستونوں کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے تحقیقی کارناموں کا احاطہ اس مختصر تذکرے میں کسی طرح ممکن نہیں۔

ANS 03

تنقید ایک مخصوص شعبہ علم ہے۔ ایک ایسافن ہے جس سے ادب یا کسی فن پارے کی قدرو قیمت کا تعین کیا جاتا ہے۔ ہر عہد میں ادب کی تفہیم کے لیے مختلف نظریات سے کام لیا جاتا رہا ہے۔ادبی تخلیقات کے مختلف گوشوں کی طرح طرح سے وضاحت کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔جس کی وجہ سے مختلف رجحانات پیدا ہوتے ہیں۔ زندگی کی قدریں جس تیزی سے تبدیل ہوتی ہیں اسی تیزی سے تہذیبی،سماجی اور ادبی رویے تبدیل ہوتے ہیںاور سائنسی تجربات کے تحت پرانی قدروں میں بدلائوآتا ہے ۔اردو ادب بھی ان تبدیلیوں سے دوچار ہوتا رہا ہے۔ ان ہی تبدیلیوں اور رجحانات کے زیر اثراردو میں ترقی پسند نظریہ سامنے آیا ۔جس نے اردو تنقید کو ایک نیا رخ دیا۔

یوں تواردو تنقید کے ابتدائی نقوش اردو تذکروں میں جابجا مل جاتے ہیں لیکن یہ تنقیدکم رائے زنی،لفاظی،اور نکتہ چینی زیادہ معلوم ہوتے ہیں۔کیونکہ اس میں ادبی تجزیے کی کوئی سائنسی اور منطقی بنیاد نہیں ملتی اور ان کا انحصار ذاتی پسند یا ناپسندپر ہوتا تھا۔تنقید کی باقاعدہ ابتداء انیسویں صدی میں مولانا الطاف حسین حالی کے ١٨٩٣ء میں شائع دیوان کے طویل مقدمے سے ہوتی ہے ۔ جس میںحالی نے شاعری کے اصول وضوابط بیان کیے ۔اسے بعد میں مقدمہ شعرو شاعری کے نام سے شائع کیا گیا۔اس کے علاوہ حالی کے ہمعصر محمد حسین آزاد کی کتاب آبِ حیات ،مولانا شبلی نعمانی کی موازنہ انیس و دبیراور شعرالعجم نے بھی اردو تنقیدکو جلا بخشی۔لیکن جہاں تک جدیداردو تنقیدکی بات ہے تو اس کا بیشتر حصہ ترقی پسند تحریک کا مرہون منت ہے۔اس تحریک نے ادب کے ہر گوشے کو متاثر کیا،اد ب میں تجربات کی نئی راہیں کھولیںاور انھیں اعتبار بخشا۔ ادب میں حقیقت،واقعیت،داخلیت

Downloaded From Tajassus.com

وخارجیت،مواد ،ہیئت کے مباحث کی ابتداء کی جس سے ذہن و فکر کے نئے دریچے کھلے-ادب و شاعری کو زندگی کی حقیقت سے آشنا کیا -اردو کی تقریبا تمام اصناف کو اس تحریک نے متاثر کیا لیکن اس کا سب سے اہم کارنامہ ادبی تنقید ہے-

بقول خلیل الرحمن اعظمی:

’’ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ادبی تنقید اردو زبان کی ایک فعال اور کارآمد صنف قرارپائی اورادب رسالوں کی ترتیب میں اسے ایک ترجیحی منصب دیا گیا-اسی دور میں ایسے ادیب پیدا ہوئے جن کے ادبی کارناموں میں تنقید ذیلی یا ضمنی نہیں بلکہ بنیادی حیثیت رکھتی ہے-ان ادیبوں نے جنھیں اس دور میں نقاد کہا گیافن تنقید کی ایک پیشہ وارانہ انہماک کے ساتھ برتنے کی کوشش کی اور صرف اپنی تنقیدی تحریروں کی بدولت انہیں صف اول کے ادیبوں میں جگہ ملی-‘‘ (اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک،ص۶۵)

ترقی پسند تنقید نے دراصل اردو میں تنقیدی بصیرت کو عام کیا-ادبی قدروں کے تعین کے سلسلے میں مباحث ومکالمے کے دروازے کھولے -ان ہی مباحث نے مواد و ہییت اور اظہار واسلوب کے نئے تجربات کی ہمت افزائی کرکے ادب کے افق کو بے پناہ وسعتوسے آشنا کیا-

ترقی پسند تنقید اس بات پر اصرار کرتی ہے کہ ادب محض تصوراتی اور خیال آرائی نہیں بلکہ زندگی کا ترجمان ہے-ا س لیے زندگی کو اس کے تمام حسن رعنائی اور دلکشی کے ساتھ پیش کرنا چاہیے-ادب کو زندگی ،سماج، ماحول اور زمانے کے پس منظر میدیکھنے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے داخلیت و خارجیت کے مابین گہرے ربط کی نشاندہی کرکے ادب کے سماجی اور اجتماعی پہلوئوں کی وضاحت کرنا ترقی پسند تنقید کا مقصد ہے-ادب کی تعریف و تفہیم ،مواد ہیئت کے رشتے رمزیت و اشاریت ،حقیقت نگاری،ادب و سماج، اجتماعیت وانفرادیت اور اظہار و اسلوب کے مسائل پر ترقی پسند تنقید نے ایک نئی بحث کا آغاز کیا اور یہ بحث اس بنا پر بہت اہم تھی کہ ادب کے مسائل پر اس طرح اس سے پہلے گفتگو نہیںہوئی تھی-اس تحریک نے ادیب ،قاری،نقاد سب کو شریک کرکے تنقیدی شعور اور بصیرت پر جلا کی اور فکری وادبی مسائل پر غور وخوص کی ابتداء کی جن سے ادب میں نئے تجربات کی راہ ہموار ہوئی-ترقی پسند تنقید میں مواد و اسلوب اور ہیئت و مواد میں ایک صحت مندافادی رشتہ نظر آتا ہے- ادب کے افادی اور سماجی تصورات اس کی خاصیت ہے-ماحول،سماج اور تاریخ سے متعلق معاشی،سماجی،معاشرتی،اقتصادی وطبقاتی کشمکش ترقی پسند تنقید کا محور ہے-

دراصل ترقی پسندوں کے نزدیک ادب اس جماعت کا ترجمان ہے-جو کسی سماج کے اقتصادی و پیداواری قوتوں کے تحت وجود میںآتا ہے-کیونکہ اشتراکیت ترقی پسند تحریک کی بنیاد تھی-

Downloaded From Tajassus.com

اس لیے ترقی پسندوں نے اس بات پر زور دیا کہ سرمایادارانہ جمہوریت کی اقتصادی نابرابری کے خلاف مزدوروں ،کسانوں اور مظلوم متوسط طبقے کی ترجمانی اور اس کی حمایت ادب کا سماجی یا اجتماعی فریضہ قرار دیا جائے-ترقی پسندوں کا یہ ماننا تھا کہ اشتراکی نظریہ ہی ہمیں اس حقیقت سے آگاہ کرتا ہے کہ سرمایا داری کا غلبہ ختم کرنے کے لیے دنیا کی مزدور جماعت دوسرے مظلوم طبقوں کے اشتراک سے سیاسی طاقت کو سرمایا داروں کے ہاتھ سے چھین لے گی-

ترقی پسندوں کاماننا ہے کہ ادب عوام کے لیے ہے اس لیے جتنا ممکن ہو ادب کو انفرادی نہیں اجتماعی طور پر پھیلانے کی کوشش کی جانی چاہیے-لہٰذاادب کو اجتماعی زندگی کا ترجمان بنانے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں ادب محض امیروں کی کوٹھیوں تک محدود نہ تھابلکہ وہاں سے نکل کر ایک غریب مزدور کی جھونپڑی تک بھی اس کی رسائی ممکن ہوئی-کیونکہ ادب سماج کے بغیر اور سماج ادب کے بغیر وجود میں نہیں آسکتا لہٰذا ترقی پسند ناقدین نے بھی فن پارے کی قدرو قیمت کے تعین میں خارجی عوامل یعنی سیاسی،سماجی،معاشرتی ،معاشی واقتصادی اور داخلی عوامل یعنی خود ادیب کے خیالات وافکار ،احساسات وجذبات اور نجی تجربات دونوں کو کارفرما تصور کرتے ہیں-

بقول ڈاکٹر انور پاشا:

کسی فنکار کی تخلیقات کی تفہیم وتنقید اس فنکار کی شخصیت ،اس کی وراثت ،اس کی ذہنی تربیت ،اس کے مزاج،اس کی بصیرت وادراک،اس کے عہداور عہد کی طبقاتی وابستگیوں کے باہمی تصادم کی تفہیم و تجزیے کہ بغیر ممکن نہیںہوسکتی-

(ترقی پسند تنقید کی فکری بنیادیںاور اس کے اثرات،ص۱۷)

یہ بات واضح ہے کہ ترقی پسند نقاد ادب کو مقصد کی صورت دیکھتے ہیںاور ادب میں افادی پہلو کے قائل ہیں-ان کے خیال میں ادب کا ایک مقصد ہوتا ہے-یہ مقصد سماج کے کمزور طبقے مزدو ،کسان، اور مظلوم ہیںجو بھوک،غربت اور مصیبت میںرہتے ہیںان کو انصاف دلانا ہے-ادیب غیر جانبدار نہیں بن سکتا کیونکہ وہ ایک خاص طبقے کی فلاح چاہتا ہے-

بقول پروفیسر احتشام حسین:

’’جب ہم موجودہ دور کے عالمی ادب پر نگاہ ڈالتے ہیں تو یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ عوام دوست ادیب کی جانبداری کا اعلان کرتے ہیںاور جو کچھ لکھتے ہیںشعوری طور پر عوام کے مفاد کے لیے لکھتے ہیں‘‘-(ذوق ادب وشعور،ص۱۴)

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ترقی پسند تنقید ی تصورات تاریخی ،سماجی،سیاسی اور اشتراکی نظریات کے زیر اثر پروان چڑھے-جس کے سبب ترقی پسند تنقید نے ان نظریات کے

Downloaded From Tajassus.com

ذریعہ ادب کو پہلے کے برعکس نہایت وسیع خیالات اور رجحانات سے ہمکنار کیا-جس کے نتیجے میں اردو ادب کے سرمائے میں بیش بہا اضافہ ہوا-جس نے اردو ادب کو ادبیت کے محدود دائرے سے نکال کر دیگر زبانوں کے ادبی سرمایے سے استفادہ کی طرف مائل کیا-

ترقی پسند ناقدین کے اصول ونظریات کے حوالے سے کئی پہلو سامنے آتے ہیں- ان پہلو کو جاننے کے لیے ضروری ہے کہ ان ناقدین کی کاوشوں پر نظر ثانی کی جائے- ترقی پسند ناقدین کی اچھی خاصی تعداد ہے جس کو ہم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں-پہلی صف میں اختر حسین رائے پوری،سجاد ظہیر،ڈاکٹر عبدالعلیم اور فیض احمد فیض کے نام لیے جاسکتے ہیں-ان ناقدین نے ترقی پسند کے مفہوم کو متعین کرنے اور ترقی پسند ادب و تنقید کے بنیادی مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی-اختر حسین رائے پوری کا ۱۹۳۵ میں شائع مضمون 'ادب اور زندگی 'اپنے زمانے کا بوطیقا سمجھا جاتا ہے-انھوں نے بہت سے مضامین لکھے جس میں ادب اور زندگی کے رشتے اور ترقی پسندی کے مفہوم کی وضاحت کی -اپنی تحریروں کے ذریعے ادب وتنقید کے ترقی پسند نقطہ نظر کو عام کرنے میں اہم نام سجاد ظہیر کا ہے-وہ ایک ادیب ،افسانہ نگار اور نقاد تھے-نقاد کی حیثیت سے ان کی کتاب 'ذکر حافظ' اور نظریاتی تنقید کے سلسلے میں ان کے مضامین ترقی پسند تنقید کا بہترین سرمایہ ہے-ان کے یہاں ادب،جدلیت،انقلاب،اور سماج کا جو تصور ملتا ہے اسے بلاشبہ ترقی پسند تنقید کی اساس قراردیا جاسکتا ہے-ان کے علاوہ مجنوں گورکھپوری،ڈاکٹر اعجاز حسین،عبدالعلیم کی تحریریں ترقی پسند تنقیدکا اہم سرمایہ ہیں-ترقی پسند تنقید کے دوسرادورعبوری دور ہے -کیونکہ اس میں عقلیت ،عمرانیات،اور سماجی ومعاشرتی حقیقت نگاری کو کافی فروغ حاصل ہوا-ا س دور میں ناقدین کی ایک بڑی تعداد سامنے آئی جن میں سید احتشام حسین،عزیز احمد،آل احمد سرور،اختر انصاری، ممتاز حسین ، علی سردار جعفری،سبط حسین،احمد ندیم قاسمی،مجتبی حسین ،ظ-انصاری،ظہیر کاشمیری،وقار عظیم کے نام اہم ہیں-سید احتشام حسین نے اپنی تصانیف تنقیدی جائزے،روایت اوربغاوت،ادب اور سماج،تنقید اور عملی تنقید،ذوق ادب و شعور،عکس اور آئینے،افکار و مسائل،اعتبار نظرلکھ کر نظریاتی تنقیدی اصولوںکو مرتب کر قدامت پسندی،اور انتہا پسندی،جدلیاتی مادیت کے مباحث میں ترقی پسند تنقید اور ادب کو واضح بنیادوں پر پیش کرکے سائنٹفک تنقید کی بنیادڈالی-آل احمد سرورنے اردو تنقید کوگیرائی،معنویت،تہہ داری،اور توازن وقارعطا کیااورتنقیدی اشارے،نئے پرانے چراغ،ادب اور نظریہ،تنقید کیا ہے،نظر اور نظریے ، مسرت سے بصیرت تک،جیسی اہم تنقیدی تصانیف قلم بند کیں-

Downloaded From Tajassus.com

اس کے علاوہ دیگر ناقدین اور ان کی تصانیف مثلاعزیزاحمدکی کتاب’ترقی پسند ادب‘‘اقبال ایک نئی تشکیل ‘علی سردار جعفری کی ’ترقی پسند ادب ’پیغمبران سخن‘،اختر انصاری کی ’افادی ادب‘‘ادبی ڈائری ‘‘حالی اور نیاتنقیدی شعور‘،ممتاز حسین کی’ نقد حیات‘‘ادبی مسائل‘‘نئی قدریں‘‘نئے تنقیدی گوشے‘‘ادب اور شعور‘‘حالی کے شعری نظریات‘‘امیر خسرو دہلوی حیات اور شاعری‘،علی جواد زیدی اور اختر اورینوی کی تنقیدی کاوشیں قابل قدر ہیں جس کے سبب ترقی پسند تنقید نے لگاتارعروج کی منزلیں طے کرتی گئی -ترقی پسند کا تیسرا دورتنقید نگاروں کی تعداد کے لحاظ سے سب سے بڑا دور ہے-کیونکہ اس دور میں جو ترقی پسند ادبی نقاد منظر عام پر آئے وہ ناقدین جدید ترقی پسندی کے معمارہیں-اس دور میں ہی ترقی پسندی کی بازیافت اور اس کی نئی تفہیم و تعبیرکاکام ہوا-ان اہم نقادوں میں محمد حسن نے ادبی تنقید،شعر نو،جدید اردو ادب،ادبی سماجیات،معاصر ادب کے پیش رو،،عبادت بریلوی نے تنقیدی زاویے،غالب کا فن،جدید اردو ادب،تنقیدی تجربے،شاعری اور شاعری کی تنقید،جدید شاعری،غزل او رمطالعہ غزل،محمد عقیل رضوی نے ’نئی فکریں،نئی علامت نگاری،تنقید اور عصری آگہی،سماجی تنقید اور تنقیدی عمل،عملی انتقادیات،اصول تنقید اور ردعمل، وحید اخترنے تخلیق و تنقید،غالب کا فکری پس منظر،اقبالیات،فلسفہ اور ادبی تنقید، شارب ردولوی نے جدید اردو تنقید، آزادی کے بعد دہلی میں اردو تنقید،مطالعہ ولی،معاصر اردو تنقید:مسائل و میلانات،اردو مرثیہ وغیرہ جیسے اہم تنقید نگارونے اپنی تنقیدی کاوشوں سے ترقی پسند تنقید کو بام عروج تک پہچانے میں اہم رول اداکیا ہے-مذکورہ ناقدین کے علاوہ اسلوب احمد انصاری،احمد علی فاطمی،خورشید اسلام،اصغر علی انجینر، علی جاویدوغیرہ کے نام اہم ہیں-

اگر ان تینوں ادوار کے ترقی پسند نقادوں کی تنقیدی کاوشوں پر نظر ڈالیں تو خیال و نظرکے کئی پہلو سامنے آتے ہیں-ان میں کسی کی تنقید ی تحریروں میں تاریخی آگہی اور روح عصر کا عنصر نمایاں ہے تو کسی کے یہاں طبقاتی روابط، معاشرتی کشمکش اور مادی پہلو کا،کسی نے نفسیاتی معلومات کو زیادہ اہمیت دی تو کسی کے یہاں افادیت ومقصدیت کا رجحان حاوی ہوگیا ہے-غرض کہ متنوع نقطہ نظر مختلف خیالات ونظریات کی ہم آہنگی ہے جو مرکب ہو کر فن تنقید کا معیار بنی ہے-اس میں تاریخی، سماجی،مارکسی،عمرانی،نفسیاتی اور سائنٹی فک سبھی قسم کے تنقیدی رجحانات باہم متصل ہیں-مختصر یہ کہ ترقی پسند تنقید نے تنقید کی نئی راہیںہموار کیں اور نئے تجربات،فکرو خیالات ،تنقید کے نئے معیار قائم کیے جس سے تنقید کو باقاعدہ ایک صنف کی حیثیت حاصل ہوئی اور لوگوں میں ا س کو پڑھنے کا شوق بھی پیدا ہوا-مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ترقی پسند تنقید اور ناقدین نے ادبی تنقید کو سائنسی

Downloaded From Tajassus.com

اور معروضی انداز بخشنے میں کامیابی حاصل کی۔تنقید میں ذوق و وجدان کے بجائے سماجی شعوراور زندگی سے اس کے رشتے رہنما بنے۔ساتھ ہی تحسین اور سخن فہمی کا وہ معیارعطا کیا جس سے ادبی تنقیداردو زبان کی ایک فعال اور کارآمد صنف بن گئی۔★

ANS 04

سلیم احمد صاحب کی فکر میں جن الفاظ کو کلیدی حیثیت حاصل ہے، وہ ہیں روایت، مابعدالطبیعیات، معرفت، عقل کلی، وغیرہ۔ سلیم صاحب اگر اپنی دریافتوں کو شعروادب کی تفہیم تک محدود رکھتے تو یہ ان کے حق میں بہتر ہوتا کیونکہ ان کا اصل میدان یہی تھا۔ مگر انہوں نے اپنی حدود کا لحاظ نہ کرتے ہوئے ایک ایسے دائرے میں قدم رکھا جو ان کا اصل میدان نہ تھا، اور مذہب، تصوف، فلسفہ اور سائنس کے مہمات مسائل پر کچھ اس انداز میں رائے زنی کی ہے کہ ان کے علم، بصیرت، ذہانت اورفہم سب پر شبہ سا ہونے لگتا ہے۔

سلیم صاحب نے چو نکہ دین حق کی صحیح تعبیر و تفسیر کا دعویٰ کیا ہے اور کچھ لوگ ان کے اس دعویٰ پر ایمان بھی لے آئے ہیں۔ اس لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ ان کے اس دعویٰ کو علم اور دلیل کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھاجائے اور یہ معلوم کیاجائے کہ اس میں حق کتنا ہے اور باطل کتنا۔

سلیم صاحب کے کلیدی تصورات کے تفصیلی دلائل معلوم کرنے کے لیے، جب ان کی کتابوں وقت کی راگنی، اور جدیدیت کی طر ف رجوع کیا جاتا ہے تو بڑی افسوس ناک صورت سامنے آتی ہے۔ ان کی تحریر میں یا دعاوی اور فتاویٰ ہیں یا پھر طعن و تشنیع، طنز، تمسخر اور استہزا۔ اس مضمون میں ہمارا ارادہ ہے کہ ان کے بنیادی تصورات کا تنقیدی جائزہ لیا جائے۔ بطور خاص 'روایت اور' مابعد الطبیعیات 'کا۔

اپنے تصور روایت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"مشرق کی حد تک تو مسئلہ بالکل واضح ہے، مسلمان ہوں یا ہندو، یا بدھ، سب کا اتفاق دو چیزوں پر تو ہے : پہلی بات یہ ہے کہ معاشرتی روایت، ادبی روایت، دینی روایت، یہ الگ الگ چیزیں نہیں بلکہ ایک بڑی اور واحد روایت ہے جو سب کی بنیاد ہے۔ اور باقی سب چھوٹی روایتیں اسی کا حصہ ہیں اور اسی سے نکلی ہیں۔ اسلامی اصطلاح کے مطابق اس بنیادی روایت کا نام 'دین' ہے۔ ثانوی روایتوں میں شامل ہونے کے لیے اس بنیادی روایت میں شامل ہونا لازمی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ بنیادی روایت نکلتی ہے کسی آسمانی یا مقدس کتاب سے۔ پھر اس کی وضاحت کرتے ہیں اس کے مستند نمائندے اور صرف انہیں مستند نمائندوں کا قول قابل استناد

Downloaded From Tajassus.com

ہوتاہے۔ پھر ایک تیسری بات ہے جو ہر زبان میں خود لفظ روایت کے مفہوم کا لازمی جزو ہے۔ یعنی روایت وہ چیز ہے جو ایک آدمی سے دوسرے آدمی تک پہنچائی جائے“ ۔ (1)

اس اقتباس میں چار باتیں قابل غور ہیں :

1- اسلام، ہندو مت اور بدھ مت میں بنیادی روایت مشترک ہے۔

2- روایت کا سرچشمہ آسمانی یا مقدس کتاب ہے۔

3- کتاب کی تفسیر و تشریح کا حق صرف مستند نمائندوں کو ہے۔ انہی کے قول کو سند مانا جاسکتاہے۔

4- روایت وہ چیز ہے جوایک آدمی سے دوسرے آدمی تک پہنچائی جائے۔

میں اس آخری قضیے کا تجزیہ سب سے پہلے کرنا چاہتا ہوں کیوں کہ سلیم صاحب کے نزدیک زبانی روایت ہی اصلی روایت ہے۔ ’جدیدیت‘ میں لکھتے ہیں :

”صرف اسلام ہی نہیں، مشرق کے سارے ادیان کا انحصار زیادہ تر زبانی روایت پر ہے، لکھی ہوئی کتابوں پر نہیں۔ ہمارے نزدیک کسی دین کے زندہ ہونے کا معیار یہ ہے کہ روایت شروع سے لے کر آج تک کلی حیثیت سے سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی چلی آ رہی ہو“ (2)

مشرق میں جو بڑے بڑے مذاہب پیدا ہوئے ہیں، وہ اسلام، یہودیت، عیسائیت، ہندو مت، بدھ مت، تاؤ مذہب، اور زرتشتی مذہب ہیں۔ اب جہاں تک یہودیت کا تعلق ہے سلیم صاحب کو یہ بات معلوم ہی ہو گی کہ حضرت موسیٰؑ کو وحی تحریری صورت میں بھی ملی تھی۔ دین ابراہیمی میں جتنے انبیاء ہوئے ہیں، ان کی وحی کو قرآن نے ’کتاب‘ کا نام دیا ہے۔ اور کتاب تحریری چیز ہی کو کہتے ہیں۔ جہاں تک موجودہ تورات کی تحریری اور زبانی روایت کا تعلق ہے۔

وہ دونوں منقطع ہیں اور کسی روایت کی سند حضرت موسیٰؑ تک نہیں پہنچتی۔ حضرت موسیٰؑ نے اپنی زندگی میں تورات کی بارہ نقلیں کرواکر بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں کے سپرد کی تھیں اور بنی لادی کو بطور خاص تورات کی حفاظت پر مامور کیا تھا۔ بعد میں بنی لاوی ہی مذہبی پیشوا ئی کے منصب پر فائز ہوئے۔ تورات مٹی کی تختیوں پر لکھی ہوئی ایک مقدس صندوق میں بند تھی۔ حضرت موسیٰؑ کی زندگی کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد وہ تورات سے اس حد تک غافل ہوگئے تھے کہ انہیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اس نام کی کوئی کتاب ان کے پاس موجود بھی ہے۔

یہودیہ کے بادشاہ یوسیاہ کے عہد میں جب ہیکل کی مرمت ہوئی تو اتفاق سے سردار کاہن کو ایک جگہ تورات رکھی ہوئی مل گئی اور اسے بادشاہ کے سامنے یوں پیش کیا گیا جیسے ایک عجیب انکشاف ہوا ہو۔ 597 قبل مسیح میں جب بخت نصر نے بیت المقدس پر حملہ کر کے ہیکل میں آگ لگا دی تو بقیہ چیزوں کے ساتھ وہ مقدس صندوق بھی جل گیا۔ اس تباہی کے دو

Downloaded From Tajassus.com

اڑھائی سو برس بعد حضرت عزیر نے بنی اسرائیل کے کاہنوں اور لاویوں کے ساتھ مل کر تورات کو دوبارہ مرتب کیا۔

یہاں یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ یہود میں تورات کے حافظ موجود تھے۔ جو لوگ تورات سے اس حد تک غافل ہوں ان کا حفظ کرنا بعید ازقیاس ہے۔ پھر زبانی روایت کا عالم یہ تھا کہ یہود کے یہاں خدا کے لیے جو لفظ تھا وہ اس کے تلفظ سے بھی واقف نہ تھے۔ اور اس طرح انہوں نے خدا کے نام کو ضائع کر دیا تھا۔ آج دنیا میں وہ عبرانی نسخہ بھی موجود نہیں ہے جسے حضرت عزیر نے مرتب کیا تھا بلکہ صرف اس کا یونانی ترجمہ موجود ہے۔ اس اعتبار سے یہود کے یہاں روایت کے تسلسل کا حال بخوبی معلوم ہوجاتا ہے ۔

عیسائیت کا دار و مدار اناجیل اربعہ اور رسولوں کے خطوط اور اعمال پر ہے۔ ان چاروں انجیلوں کے مصنف نہ تو حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں میں سے ہیں اور نہ واقعات کے عینی شاہد۔ ان انجیلوں کازمانہ تصنیف حضرت عیسیٰؑ کے بعد ستر سے ایک سو چالیس سال کا ہے۔ ان میں سے یوحنا کی انجیل تو بطور خاص پال کے زیراثر لکھی گئی ہے۔ خود پال حضرت مسیح ؑ کا حواری نہ تھا۔ بلکہ ان کی زندگی میں ان کا سخت مخالف رہا تھا۔ بعد میں اس نے یہ کہا کہ اسے مسیح ؑ کی تعلیمات کو ان کے ان پڑھ شاگردوں سے معلوم کرنے کی ضرورت نہیں۔

چنانچہ اس کا دعویٰ یہ تھا کہ اس نے اسے براہ راست مسیح ؑ سے بطریق مکاشفہ اخذ کیا ہے۔ اسی لیے حضرت مسیحؑ کے سچے حواریوں نے پال کو مبتدع اور گمراہ قرار دیا تھا۔ ابتدا میں انجیلوں کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی۔ 327 عیسوی میں ایتھاناسیوس ATHANASIUS کے ایک خط کے ذریعے معتبر و مسلم کتابوں کے مجموعہ کا اعلان کیا گیا۔ پھر اس کی توثیق 382 میں پوپ ڈیمیسیس DEMESIUS کی زیر صدارت منعقد ہونے والی ایک مجلس نے کی۔ موجودہ عہد نامہ جدید کا پہلا مستند متن قرطاجنا کی کونسل میں منظور کیا گیا جو 397 ء میں منعقد ہوئی تھی اور یہ تمام تر فیصلے پولوسی عقائد کی بنا پر کیے گئے کیونکہ اس وقت تک تثلیث کو مسیحیت کا سرکاری عقیدہ قرار دیاجاچکا تھا۔ (3)

زرتشتی مذہب کے ماننے والے اوستاتیر کو اپنی مقدس کتاب قرار دیتے ہیں محققین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ ایک جعلی کتاب ہے اوراس کا زرتشت سے کوئی تعلق نہیں۔ (4)

چین میں تاؤمذہب کے ماننے والے بھی ایک مذہبی صحیفہ تاؤتی چنگ کو لاؤتزے سے منسوب کرتے ہیں۔ اول تو لاؤتزے کی شخصیت ہی مشتبہ ہے کہ آیا کہ وہ کوئی تاریخی شخص تھا یا محض ایک اساطیری کردار۔ اگر اس کی شخصیت کو تسلیم کر بھی لیا جائے تو چینی مذہب کے ماہرین اس با ت پر متفق ہیں کہ مذکورہ بالا صحیفہ اس کے بہت بعد کی تصنیف ہے۔ (5)

Downloaded From Tajassus.com

جہاں تک ہندو مت کا تعلق ہے تو اس کی قدیم ترین کتابیں وید ہیں۔ ویدوں کے زمانہ تصنیف کے بارے میں شدید اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ پھر ان کے مصنفین کے نام بھی کسی کو معلوم نہیں۔ ویاس کہ جس کے بارے میں دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اس نے ویدوں کو مرتب کیا، خود ایک اساطیری شخصیت ہے جس کا شاید کوئی وجود نہیں تھا۔ یہی حال اپنشدوں اور براہمنوں کا ہے۔ ان کے بارے میں یہ بیان کرنا ممکن ہی نہیں کہ ان کے مصنف کون لوگ تھے، ان کا زمانہ کون سا تھا، اگر یہ کتابیں الہامی ہیں تو وہ کون سے پیغمبر تھے جن پر نازل ہوئیں۔

یہی حال بدھ مذہب کا ہے۔ بدھ مذہب کے جتنے بھی گروہ ہیں وہ سب اپنی روایت کو مہاتما بدھ تک پہنچانے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ مگر محققین اس بات پر متفق ہیں کہ کسی روایت کا بدھ پہنچنا بالکل مشکوک ہے۔ فی الاصل آج یہ جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ بدھ کی اصل تعلیمات فی الواقع کیا تھیں اور بعد میں ان میں کیا تغیرو تبدل ہوا ہے۔

مسلمانوں نے حدیث میں اسماء الرجال جیسا عظیم الشان علم تخلیق کیا، جس پر وہ بجا طور پر فخرکر سکتے ہیں۔ ایسا کوئی علم کسی دوسرے مذہب کے پاس موجود نہیں ہے جس میں روایت کا سلسلہ متصلاً زمانۂ نزول تک پہنچتا ہو۔ نراد سی چودھری نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ اسلام کے علاوہ دنیامیں جتنے بھی مذاہب موجود ہیں وہ اپنی اصل اور ابتدائی صورت سے بہت مختلف ہیں۔ (6)

اب اگر سلیم صاحب کی اس بات کو پیش نظر رکھا جائے کہ دین کے زندہ ہونے کا معیار یہ ہے کہ روایت شروع سے لے کر آج تک سینہ بہ سینہ کلی حیثیت سے منتقل ہوتی چلی آ رہی ہو تو اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا مذہب زندہ ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اس طرح سلیم صاحب کا وحدت ادیان کا تمام فلسفہ ان کے اپنے بتائے ہوئے اصول کی بنیاد پر ہی رد ہوجاتا ہے ۔

جہاں تک اسلام کے بارے میں ان کے اس دعوے کا تعلق ہے کہ اس کا انحصار زبانی روایت پر ہے تو یہ دعویٰ عجیب ہی نہیں مضحکہ خیز بھی ہے۔ اس بات پر ہر مسلمان کا ایمان ہے کہ اسلام اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ دین ہے۔ جس کے لیے اس نے حضرت محمد ﷺ کو اپنا رسول اور نبی مقرر کیا۔ وحی الٰہی من وعن قرآن کے 'بین الدفتین' محفوظ ہے اور ہر قسم کے تغیر سے مامون ومصؤن ہے۔ کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ رب العزت نے لیا ہے۔

قرآن حکیم عہد رسالت مآب سے مسلمانوں کے پاس تحریری صورت میں موجود ہے۔ خود سلیم صاحب نے اس کو تسلیم کیا ہے۔ مگر زبانی روایت کی فوقیت ثابت کرنے کے لیے فرمایا ہے کہ سند قرات کے راویوں سے لی جاتی ہے۔ (7) اب یہ بات صحیح ہے امت مسلمہ نے قرآن کو زبانی طور پر بھی محفوظ رکھا ہے۔ مگر کوئی ایسی قرات خواہ وہ کتنے ہی بلند سلسلۂ

Downloaded From Tajassus.com

سند سے کیوں نہ روایت ہوئی ہو، اس وقت تک قبول نہیں کی جائے گی جب تک (1) وہ عربی زبان کے قواعد کے مطابق نہ ہو۔

(2) اور مصحف عثمانی کے رسم الخط اور تحریر کے مطابق نہ ہو۔ اب زیادہ سے زیادہ جو بات کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام نے اپنی کتاب کی حفاظت کے لیے دوہرا طریقہ اختیار کیا ہے۔ زبانی روایت اور تحریر سے اس کی تصدیق؛ تحریر اور زبانی روایت سے اس کی تصدیق۔ تحریری اور زبانی روایت سے قطع نظر قرآن کے ہر قسم کی تحریف سے محفوظ رہنے کا اصل سبب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود اس کی حفاظت کی ہے۔ زمانۂ نزول میں قرآن کی کتابت اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر اپنے اس احسان کا بطور خاص ذکر کیا ہے کہ اس نے انسان کو قلم کے ذریعے تعلیم دی۔ اور اس قلم کو جس سے قرآن حکیم لکھا جا رہا تھا قرآن کی حقانیت پر گواہ ٹھہرایا ہے۔

سلیم صاحب کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ تصوف کے نظریات اور اشغال کو زبانی روایت کی بنا پر ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ ان کے خیال میں تصوف دین کی حقیقی روح کا حامل ہے اگر ان کے اس دعویٰ کو تسلیم کر لی جائے تو خود صوفیاء کا زبانی روایت کے بارے میں نقطہ نظر، علم حدیث کی روایت میں ان کا مقام اور محدثین کی صوفیوں پر جرح و نقد اس مفروضے کی تغلیط کے لیے کافی ہیں۔

صوفی کے علم کی بنیاد زبانی روایت پر نہیں بلکہ کشف اور وجدان پر ہے، اس لیے صوفیاء نے علم روایت کو اپنے علم لدنی کے مقابلے پر ہمیشہ حقیر خیال کیا ہے۔ شیخ ابواسماعیل ہروی نے اپنی مشہور کتاب منازل السائرین میں علم کے تین درجے گنوائے ہیں : علم بدیہی، علم خفی، علم لدنی۔ ان کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں :

(1) ”بدیہی علم وہ ہے جو انسان کے حس و مشاہدہ میں آتا ہو، یا جس کی بنیاد قابل اعتماد نقل و روایت پر ہو، یا جو سابق تجربات کی صحت پر مبنی ہو۔“

(2) ”علم خفی وہ ہے جو پاکیزہ جسموں کی پاکیزہ روحوں کے اندر نشوونما پاتا ہے، جو بے ریا ریاضت کے پانی سے سیرابی حاصل کرتا ہے، جو بلند ہمت اشخاص کے انفاس صادقہ کے اندر خلوت کے اوقات اور دنیا کے ہنگاموں سے نا آشنا کانوں میں ظاہر ہوتا ہے، یہ علم غیب کو حاضر اور حاضر کو غیب کردیتا ہے اور مقام جمع کی طرف رہبری کرتا ہے۔“

(3) ”علم لدنی وہ علم ہے جس کا وجود ہی اس کی سند ہے، جس کا ادراک ہی اس کا مشاہدہ ہے، جس کا حکم ہی اس کی تعریف ہے۔ اس کے اور غیب کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں۔“ (9)

Downloaded From Tajassus.com

اس سے یہ ثابت ہو جاتی ہے کہ صوفیاء کے نزدیک اس علم کی کیاحیثیت ہے جو قابل اعتماد نقل وروایت پر مبنی ہو۔ خود ابن عربی کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ اس ماخذ سے لیتا ہے جہاں سے رسول علیہ السلام حاصل کیاکرتے تھے۔ (10) کسی صوفی نے ترنگ میں آکر یہ کہا تھا کہ فلاں شخص محمد ﷺ کے طفیل اس مرتبہ پر پہنچا اور میں نے بلاواسطہ سب کچھ پایا۔ "(11) ملا شاہ سے منسوب یہ شعر اکثر لوگوں کی نظر سے گزراہوگا اور میں اسے نقل کفر کفر نہ باشد، سمجھ کرہی لکھ رہا ہوں

پنجہ در پنجۂ خدا دارم

من چہ پروائے مصطفےٰ دارم

اپنے کشف اور وجدان کو برتر اور معتبر جاننے کی وجہ سے صوفیاء نے علم حدیث کے پڑھنے پڑھانے سے بیزاری کا اظہارکیا ہے۔ ایک مجلس میں بایزید بسطامی سے کہا گیا کہ فلاں شخص فلاں کو ملا، اس سے علم حاصل کیا اور بہت کچھ تحریر کیا، تو بایزید بسطامی نے فرمایا "ان بے چاروں نے مردہ علم مردوں سے حاصل کیا ہے۔ ہم نے اس ذات سے تحصیل علم کی جو زندہ ہے اور اسے کبھی موت نہیں آئے گی۔" ایک صوفی سے پوچھا گیا کہ کیا آپ عبدالرزاق سے حدیث سننے کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوں گے؟ تو انہوں نے جواب دیا "جو خدا سے براہ راست استفادہ کرتا ہو وہ عبدالرزاق کو کیا کرے گا۔" ایک اور صوفی کا قول ہے "جب کسی صوفی کو حدثنا اخبرنا، میں مشغول دیکھو تو اسے خیر باد کہہ دو۔" شبلی کا ایک شعر ہے :

اذا خاطبونی بعلم الورق

برزت علیھم بعلم الخرق

"جب مجھے ورقہ کے علم سے خطاب کرتے ہیں تو میں ان پر خرقہ کا علم پیش کرتا ہوں۔" (12)

صوفیاء نے اپنے موقف کوثابت کرنے کے لیے اگرچہ احادیث کا سہارا بھی لیا ہے، مگر ان کی بیان کردہ احادیث زیادہ تر ضعیف اور موضوع ہیں۔ محدثین نے جرح ونقد کے بعد ان احادیث کو قبول کرنے سے ہمیشہ انکار کیا ہے۔ مگر تصوف کی امہات کتب ایسی ضعیف اور موضوع روایات سے بھری پڑی ہیں۔ ایسی ہی ایک روایت ہے جس سے صوفیاء نے اپنے علم باطن کے حق میں استشہاد کیا ہے، حضور ﷺ کا قول حضرت علیؓ کی روایت سے نقل کرتے ہیں۔ "علم باطن خدا کے اسرار میں سے ایک سر ہے، اور اس کے احکام میں سے ایک حکم ہے۔ جسے اولیاء میں سے جس کے دل میں چاہتے ہیں ڈالتے ہیں۔" محدث ابن جوزی اس حدیث پر نقد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ قطعی بے بنیاد ہے اور اس کی سند میں چند مجہول راوی ہیں جن کا

Downloaded From Tajassus.com

کوئی پتہ نہیں چلتا کہ وہ کون ہیں۔ (13) صوفیاء و صالحین کی علم حدیث میں اس کمزوری کا ذکر کرتے ہوئے امام مسلم نے اپنی صحیح کے مقدمے میں لکھا ہے کہ:

عن محمد ابن یحییٰ بن سعید القطان عن ابیہ قال لم نر الصالحین فی شیئٍ اکذب منهم فی الحدیث، قال ابن عتاب فلقیت انا محمد بن یحییٰ فسالتہ عنہ فقال عن ابیہ لم نراہل الخیر فی شیئٍ اکذب منهم فی الحدیث قال مسلم یقول : یجری الکذب علی لسانهم ولا یتعمدون الکذب۔

(محمد ابن یحییٰ سعید القطان اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں۔ کہ انہوں نے فرمایا کہ ہم نے صالحین یعنی صوفیاء کو سب سے بڑھ کر حدیث کے معاملہ میں جھوٹا پایا ہے۔ ابن عتاب کہتے ہیں کہ میں محمد بن یحییٰ سے ملا تو میں نے ان سے اسی مسئلہ کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے اپنے والد محترم کا یہ قول بیان کیا کہ ہم نے اہل خیر یعنی صوفیاء کو حدیث کے معاملہ سے بڑھ کر کسی معاملہ میں جھوٹا نہیں دیکھا۔ امام مسلم کہتے ہیں کہ وہ کہا کرتے تھے کہ جھوٹ ان کی زبانوں پر بے تکلف جاری رہتا ہے۔)

اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ تحریری اور زبانی روایت میں سے کسی کو فوقیت حاصل ہے۔ روایت تحریری ہویا زبانی اسے قرآن پر لو ٹایا جائے گا۔ قرآن اللہ کا کلام ہے اور تمام علم اولین و آخرین کے لیے کسوٹی ہے۔ وہ ہر شے پر حاکم ہے مگر کوئی شے اس پر حاکم نہیں۔ کسی بڑے سے بڑے امام کا قول، کسی صوفی کا وجد اور کشف اس وقت تک نا قابل قبول ہیں جب تک ان کی تائید میں قرآن سے ثبوت پیش نہ کیا جائے۔ ابن تیمیہ فرماتے ہیں :

" علم باطنی ہو یا ظاہری، شریعت ہو یا طریقت، ان کو کتاب و سنت کی کسوٹی پر رکھا جائے گا۔ مشائخ وفقراء، ملوک وامراء، اور قضاۃ وعلماء علوم کے لیے معیار نہیں ہیں، بلکہ جملہ مخلوقات پر خدا اور رسول کی اطاعت فرض ہے۔" (14)

یہ تمام تر شواہد محض اس مقصد سے پیش کیے گئے ہیں تاکہ سلیم صاحب کے اس دعوے کی حقیقت معلوم ہو سکے کہ اسلام کا انحصار زبانی روایت پر ہے۔

اس کے ساتھ میں سلیم صاحب کی اس بات کو لیتا ہوں کہ روایت کا سرچشمہ آسمانی یا مقدس کتاب ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ زبانی روایت پر اتنا اصرار کرنے کے بعد انہوں نے کتاب کو روایت کاماخذ کیوں قرار دیا۔ اور اس طرح اپنے ہی دعویٰ کو باطل کر دیا۔ مگر مجھے ان کی اس بات سے اتفاق ہے۔ اگرچہ معلوم ہوتا ہے کہ سلیم صاحب مقدس اور آسمانی کتاب کو مترادف خیال کرتے ہیں۔ آسمانی کتاب تو وہی کہلائے گی جو منزل من اللہ ہوگی اور محفوظ طور پر موجود بھی ہو گی۔

ANS 05

Downloaded From Tajassus.com

مشفق خواجہ نے متنوع علمی موضوعات پر کام کیا ہے جن میں تحقیق ایک ایسا موضوع ہے جس سے انھیں خاص دلچسپی تھی؛ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ وہ بنیادی طور پر ایک محقق تھے تو بے جا نہ ہو گا۔ اپنے تحقیقی کاموں ہی کی وجہ سے ، کہ وہ متاثر نہ ہونے پائیں ، انھوں نے انجمن ترقیِ اردو (پاکستان) سے ، جہاں وہ مددگار معتمد (اسسٹنٹ سکریٹری) کے عہدے پر فائز تھے ، گلو خلاصی لے لی تھی۔ تحقیق کے ساتھ انھیں تدوینِ متن سے بھی دلچسپی پیدا ہوئی، اور یہ دونوں کام انھوں نے بہ طریقِ احسن انجام دیے جس سے برِ صغیر میں دور دور تک ان کی شہرت پھیل گئی۔ وہ ایک خوش فکر شاعر بھی تھے اور ایک معتبر ناقد کی حیثیت سے بھی اپنی پہچان رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا معتد بہ حصہ کالم نگاری میں صرف کیا اور مختلف اخبارات و رسائل میں ادبی و سیاسی نوعیت کے کالم لکھے جن کی تعداد خود انھی کے قول کے مطابق ''دو ہزار سے زائد'' ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے ریڈیو پاکستان کے لیے مختلف موضوعات پر ا سکرپٹس بھی لکھیں جن کی تعداد تقریباً ایک ہزار بتائی جاتی ہے ، لیکن یہ حقیقت ہے کہ کالم نگاری کو وہ پسند نہ کرتے تھے ، اور نہ ہی اسے وہ اپنی ''پہچان'' بنانا چاہتے تھے۔

مشفق خواجہ ایک نہایت زندہ دل شخصیت کے مالک تھے۔ شگفتگی ، خوش طبعی ، اور بذلہ سنجی ان کے مزاج کا حصہ تھی۔ گل افشانیِ گفتار کے بھی وہ دھنی تھے۔ ان کے طنز و مزاح کی بھر پور جھلک ان کے فکاہیہ کالموں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ انھوں نے کراچی کے روزنامہ 'جسارت' ، اور بعد میں وہیں سے شائع ہونے والے ہفت روزہ 'تکبیر ' میں ''سخن در سخن'' کے عنوان اور 'خامہ بگوش' کے نام سے جو مشہورِ زمانہ ادبی کالم لکھے ان میں ظرافت کے ساتھ ساتھ طنز کا عنصر بھی نمایاں تھا جسے بعض ادیبوں نے تمسخر سمجھا اور اپنی سخت برہمی کا اظہار کیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ کالم ہر گز اس خیال سے نہیں لکھے گئے تھے کہ کسی کو ہدفِ تضحیک و تمسخر بنایا جائے یا کسی کی دل آزاری کی جائے۔ ان کی اس قسم کی تحریروں (کالموں) کو شگفتہ نگاری کے ذیل میں رکھا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ساقی فاروقی نے 'خامہ بگوش' کو مشفق خواجہ کے ''رنگیلے ہمزاد'' سے تعبیر کیا ہے۔ ان کی تحریروں سے قطع نظر، ان کی گفتگو میں بھی مزاح کی چاشنی صاف نظر آتی تھی۔

مشفق خواجہ بہت ہی مخلص انسان تھے۔ وہ ہر شخص سے بہت محبت و خلوص سے ملتے تھے۔ علمی کاموں میں دوسروں کی مدد کرنا انھوں نے اپنا شعار بنا لیا تھا۔ وہ اپنے دوستوں ، ادیبوں ، تحقیق کاروں اور ضرورت مندوں کو زرِ کثیر خرچ کر کے ان کی ضرورت اور پسند کی کتابیں مسلسل فراہم کرتے رہتے تھے ، اور یہ سلسلہ آخری وقت تک جاری رہا۔ انھوں نے نام و نمود کی کبھی کوئی فکر نہ کی اور جاہ و منصب سے بھی ہمیشہ بیزار رہے۔ وہ جلسے

Downloaded From Tajassus.com

جلوس سے بھی بہت گھبراتے تھے۔ خوشامد، جوڑتوڑاور گروہ بندی سے بھی وہ ہمیشہ دور رہے۔ انھوں نے ایک سادہ اور گوشہ نشینی کی زندگی گزاری۔ خطوط نویسی سے انھیں بے حد شغف تھا۔ وہ خطوں کے جواب بڑی پابندی سے دیتے تھے اور خود بھی خط لکھتے تھے۔ جب بھی کوئی شخص انھیں کوئی کتاب یا رسالہ بھیجتا تو اس کی رسید سے وہ اسے فوراً مطلع کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے دوستوں، ادیبوں، دانشوروں اور مشاہیر و معاصرین، نیز دیگر اہلِ علم کو تا دمِ آخر ہزاروں خطوط لکھے ہوں گے۔ وہ یونیورسٹیوں کے اساتذہ، طلبہ اور ریسرچ اسکالرز کو بھی خط لکھ کر ان کی علمی معاونت کرتے تھے۔

مشفق خواجہ سے میرا غائبانہ تعارف اس وقت ہوا جب ہند و پاک کے اردو رسائل میں ان کی بعض تحریریں میری نظر سے گزریں۔ یہ ۱۹۸۰ء کے آس پاس کی بات ہے ؛ لیکن ان سے میری مراسلت کا سلسلہ اس کے تین سال بعد شروع ہوا جب میں نے اپنی کتاب 'زبان، اسلوب اور اسلوبیات' (۱۹۸۳ء) کا ایک نسخہ انھیں ہدیتاً ارسال کیا۔ اس کے بعد سے ہم ایک دوسرے کو برابر خط لکھتے رہے اور یہ سلسلہ ان کے انتقال سے چند ماہ قبل تک جاری رہا۔ مشفق خواجہ ۱۹۸۵ء میں جب اپنی بیگم آمنہ مشفق کے ہمراہ ہندوستان آئے تو علی گڑھ بھی تشریف لائے ؛ اور یہیں ان سے میری پہلی بار ملاقات ہوئی۔ میں نے انھیں نہ صرف بے حد خوش مزاج و خوش طبع پایا بلکہ وہ نہایت خوب رو و خوش لباس بھی نظر آئے۔ وہ لطیف انداز میں گفتگو کرتے تھے اور اپنی حسِ مزاح اور چبھتے ہوئے جملوں اور فقروں سے سامعین کو ہنسنے اور مسکرانے پر مجبور کر دیتے تھے۔

جون ۱۹۸۹ء میں جب میں اپنے اعزہ سے ملنے کراچی گیا تو مشفق خواجہ سے بھی نیاز حاصل کرنے ان کے دولت کدے ۳-ڈی، ۲۶/۹ ناظم آباد پہنچا۔ ان کے ڈرائنگ روم میں ہر طرف کتابیں ہی کتابیں تھیں ؛ دیواروں سے ملی ہوئی الماریوں اور ریکس میں نیچے سے اوپر تک کتابیں ٹھسی ہوئی تھیں۔ خواجہ صاحب نے دورانِ گفتگو مجھے بتایا کہ ''اس گھر میں بارہ کمرے ہیں ، پھر بھی رہنے کا کوئی کمرہ نہیں۔'' میں ان کے گھر شام کے وقت پہنچا تھا۔ جون کا مہینہ تھا اور اُس روز سخت اُمس تھی۔ باتوں ہی باتوں میں کافی وقت گزر گیا۔ جب انھیں اچانک گرمی کی شدت کا احساس ہوا تو بولے ، ''ارے ، میں نے آپ کو بوتل پیش نہیں کی''۔ (اُن کے اِس جملے نے مجھے چونکا دیا اور اس کا مطلب میری سمجھ میں نہ آیا)، پھر وہ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور ڈرائنگ روم ہی میں ایک کونے میں رکھے ہوئے ریفری جریٹر میں سے کولڈ ڈرنک کی ایک ٹھنڈی بوتل نکال لائے اور میری طرف بڑھا دی۔

خواجہ صاحب بلا کے مہمان نواز تھے۔ وہ اپنے مہمانوں کی ضیافت کا بہ طورِ خاص خیال رکھتے تھے اور انھیں کراچی کے کسی اچھے سے ریستوراں میں کھانے پر مدعو کرتے تھے۔ کراچی

Downloaded From Tajassus.com

کے میرے دورے کے دوران (جون-جولائی ۱۹۸۹ء) ، مجھے ان کے ساتھ اس طرح کے کئی ظہرانوں اور عشائیوں میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی- وہ مجھے اپنے ساتھ، اپنی کار میں بٹھا کر، کراچی کے کئی ادبی جلسوں اور دعوتوں میں لے گئے جن میں نیپا، غالب لائبریری اور انجمن ترقیِ اردو (پاکستان) کے جلسے خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں- ان کے علاوہ حکیم محمد سعید اور راغب شکیب کے دولت کدوں پر جو محفلیں آراستہ ہوئیں اور ضیافتوں کا اہتمام ہوا، ان میں بھی مَیں خواجہ صاحب کی ہی معیت میں پہنچا- خواجہ صاحب کی یہ سب باتیں ، خوش گوار یادیں بن کر ذہن پر نقش ہو چکی ہیں-

Downloaded From Tajassus.com